R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Rate 1-8-15-22

Phone—29

Annual Rs. 4/-

Per Copy -/12 P

جلد ۲۵ ـ شمارہ ۴۸ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ دسمبر ۱۹۶۶ء

اداریہ

۱۹۶۶ء پر ایک نظر

یہ سال ہمارے ملک کے لیے مختلف وجوہ سے پریشانی کا رہا ہے۔ ملک میں غذا کی قلت ہے۔ مشرقی یوپی اور بہار میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے غلے کی پیداوار بہت کم ہوئی۔ گرانی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ روپے کی قیمت میں کمی کی وجہ سے یہ سلسلہ اور تیز ہو گیا ہے۔ طالب علموں میں ہیجان ہے اور آئے دن ہنگاموں کی خبریں آتی ہیں، کچھ طلبا توڑ پھوڑ کرتے ہیں، پولیس گولی چلاتی ہے اور تشدد بڑھتا جا رہا ہے۔ قانون کا احترام کم ہو گیا ہے اور لوگ عام طور پر صرف اپنے حقوق کی بات کرتے ہیں فرائض کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ سیاست دانوں کو صرف اگلے چناؤ کی فکر ہے جسے اقتدار حاصل ہو گیا وہ ہر قیمت پر اسے باقی رکھنا چاہتا ہے۔ جو مخالف جماعت ہے وہ اگر جمہوری طریقوں سے اقتدار حاصل نہیں کر سکتا تو ہنگامہ کر کے جمہوریت کی گاڑی میں روڑے اٹکاتا ہے۔ شرم کی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی بیرونی ملک کسی وجہ سے امداد نہیں دینا چاہتا تو لوگ اس پر خفا ہوتے ہیں گویا امداد دینا ترقی یافتہ ملکوں کا فرض اور امداد حاصل کرنا ترقی کرنے والے ملکوں کا پیدائشی حق ہے۔ ہر ریاست میں لوگ زبان کے سرحدی علاقوں کے لیے جھگڑے کھڑے کر رہے ہیں۔ بھوک ہڑتال ایک اخلاقی حربہ تھا اب ایک سیاسی حربہ بن گیا ہے۔ ایک مذہب کے ماننے والے چاہتے ہیں کہ اگر وہ اکثریت میں ہیں اور کچھ باتوں کو وہ اپنے مذہب کے خلاف سمجھتے ہیں تو سب مذاہب والوں کے لیے بھی ان پر پابندیاں لگا دیں۔ اقلیت والے یہ سمجھتے ہیں کہ اکثریت کا فرض انھیں ہر طرح پر راضی خوشی رکھنا ہے، ان پر کوئی ذمہ داری نہیں کہ اکثریت کا بھی لحاظ رکھیں یا قوم کے مطالبات پورے کریں۔ ایک عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اسے کچھ کرنا نہیں ہے جو کچھ کرنا ہے حکومت کو کرنا ہے۔ اگر کسی کا کوئی کام نہ ہو تو وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے سے نہیں چوکتا۔ اس کے یہاں کوئی حد ادب نہیں ہے۔

یہ صورت حال خاصی تشویشناک ہے، مگر اس کی وجہ سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا کہ ہمارے یہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ملک میں مخلص لوگوں کی کمی نہیں۔ ایسے لوگ بھی خاصی تعداد میں ہیں جو ایمان دار ہیں اور اپنے فرائض کو پہچانتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی بہت ملیں گے جن کو جمہوریت، سیکولرزم اور قومی یک جہتی پر پورا اعتقاد ہے مگر وہ عمل میں نرم ہیں۔ وہ سائے میں چلنا چاہتے ہیں، خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے یہاں صلاحیت ہے، جو محنت کرتے ہیں، جو عقل سے کام لینا جانتے ہیں۔ جو ماضی کی روایات کا احترام کرتے ہوئے ماضی کے اسیر نہیں ہیں بلکہ حال کی ضروریات کو سمجھتے ہیں مگر یہ لوگ بھی کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتے، یہ مقبول رہنا چاہتے ہیں، اس لیے غلط خیالات کو، نامناسب اقدامات کو، نازیبا حرکات کو روک نہیں پاتے۔ اگر ملک کو اس دلدل سے نکلنا ہے تو ایسے لوگوں کو ہمت سے کام لینا پڑے گا، خطرات مول لینے پڑیں گے اور قوم کی خاطر، جمہوریت کی بقا کی خاطر، اور سماجی فلاح کی خاطر تخریبی کارروائیاں چھوڑ کر تعمیری کاموں میں لگ جانا ہوگا۔ [illegible] نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جن ملکوں کو حال میں آزادی ملی ہے ان میں توقعات تو بہت ہیں، عزم کم ہے۔ عقیدہ تو ہے مگر ہمت نہیں ہے، فخر و غرور عام ہے مگر چیزوں کی پرکھ کی صلاحیت نہیں۔ ہم اس میں یہ اضافہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ان میں جذباتیت زیادہ ہے، یہ باتیں بہت کرتے ہیں۔ یہ بقول [illegible] اپنے لیے زندگی اور دوسروں کے لیے مذہبیت کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ان کی پرانی نسل صرف اپنے بڑے پن کی بنا پر ہر چیز پر قابض رہنا چاہتی ہے اور ان کی نئی نسل عمل کے شوق میں توڑ پھوڑ اور بغاوت اور ماضی کی ہر چیز سے انکار کو اپنے نئے پن کا علم اور نشان سمجھتی ہے۔ ہم ہندوستانی اگر دوسروں کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے اندر دیکھ سکیں، بڑی بڑی باتیں کرنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے کام اچھی طرح انجام دینا اپنی عادت بنا لیں، اصول کو سپر کی طرح نہیں بلکہ اس تیغ کی طرح استعمال کریں جو [illegible] کو بھی کاٹ سکتی ہے، اور آج کے چھوٹے چھوٹے فائدوں کے بجائے کل کی صلاح و فلاح پر نظر رکھیں تو ہم اپنی ساری مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔ مٹی زرخیز ہے مگر اسے نمی کی ضرورت ہے، آنکھوں کی نمی نہیں آنسوؤں اور پسینے کی۔

ادیب فری ریڈنگ روم کا افتتاح

بمقام لکشمیشور ضلع دھارواڑ کتب خانہ کا افتتاح شام کے ٹھیک ۶ بجے ادیب فری ریڈنگ روم کا افتتاح عالی جناب حضرت صاحب گنگواڑ رئیس اعظم لکشمیشور کی صدارت میں ہوا اور صدر محترم کا تعارف جناب ابراہیم صاحب زرگی نے اپنے مخصوص انداز میں کروایا۔ حضرت گل صاحب ہیڈ ماسٹر، حضرت ابراہیم صاحب مدرس، حضرت خواص صاحب مدرس، حضرت علی صاحب مدرس، حضرت انچی صاحب شاد اور حضرت ریاض صاحب نے اردو کی اہمیت، اس کی بقاء و تحفظ سے متعلق پر زور تقریریں۔ خصوصی مہمان ڈاکٹر رحیم صاحب کورنگی نے کنڑی زبان میں تقریر کی۔ جلسہ میں زیادہ تر طلبہ، اساتذہ، اساتذہ اور تاجران لکشمیشور کثیر تعداد میں شریک رہے۔ صدر محترم کی پرجوش تقریر کے بعد جناب ابراہیم صاحب زرگی کے شکریہ کے ساتھ رات کے ۸ بجے جلسہ کا اختتام رہا۔ اس دارالمطالعہ کا اجراء عالی جناب مولانا شاہ ابوالحسن صاحب میسوری مرحوم کی یاد میں ان ہی کے نام سے موسوم ہوا۔ (آر۔ رحیم ملا صاحب، آشنگی صاحب)

آقائے سعید نفیسی کا انتقال ہوگیا

ایران کے مشہور استاد، ادیب اور دانشمند آقائے سعید نفیسی کا ۷۱ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

پروفیسر سعید نفیسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فارسی ادبیات کے استاد رہ چکے تھے۔

۱۸۹۵ء میں پیدا ہونے والے سعید نفیسی نے قدیم طرز کی تعلیم کے بعد فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں مغربی تعلیم حاصل کی اور ایران واپس آکر درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں کابل یونیورسٹی سے بھی منسلک رہے۔ انھوں نے ۱۰۰ کتابیں لکھیں یا مرتب کیں، ایک سو سے زیادہ علمی مقالے اور ڈیڑھ سو مضامین فرانسیسی، انگریزی، روسی، رومی، عربی اور اردو میں تحریر کیے۔ وہ تصوف اور صوفیانہ شاعری کے قدر شناس تھے اور اقبال کے نظریۂ خودی کے مداح تھے۔

آقائے سعید نفیسی نے مسلم یونیورسٹی کے علاوہ الہ آباد، بمبئی، پٹنہ، بنارس، ترپونڈرم، حیدرآباد، دہلی، کلکتہ، لکھنؤ، مدراس، اور ناگپور کی ہندوستانی یونیورسٹیوں میں فارسی ادبیات کی تعلیم و تدریس میں دلچسپی اور عملی حصہ لیا تھا۔

ان کے پس ماندگان میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں شامل ہیں۔

(قومی آواز لکھنؤ)

جمیل جالبی کی نئی کتاب "تنقید اور تجربہ"

کراچی۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے ممتاز ادیب و نقاد جمیل جالبی کے منتخب تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تنقید اور تجربہ" جنوری ۱۹۶۷ء میں مشتاق بک ڈپو نزد اردو کالج، شیلڈن روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع ہو رہا ہے۔

اردو مشاعروں کو سماجی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہیئے

ادارۂ مصنفین نو کے حیدرآباد کے زیر اہتمام سمپوزیم

حیدرآباد: "ہر فنکار کو سماج کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ فن کی تخلیق ایک سماجی عمل ہے۔ جب دنیا میں ایک بھی آدمی باقی نہ رہ جائے گا اس وقت فن باقی رہے گا نہ زبان" ان خیالات کا اظہار کل شام ملک کے ممتاز شاعر جناب مخدوم محی الدین نے ایک سمپوزیم میں کیا جو ادارۂ مصنفین نو کے زیر اہتمام زنانہ طبیہ کالج، صدر شفاخانہ چار مینار میں منعقد کیا گیا تھا۔ سمپوزیم کا عنوان "اردو مشاعرے کو روایتی انداز سے بچا کر کس طرح سماج اور ادب کے لیے مفید بنایا جا سکتا ہے؟" دیا گیا تھا۔ اس مباحثہ میں جناب مخدوم محی الدین، جناب میر حسن، جناب اختر حسن اور جناب ابن احمد تاب نے حصہ لیا۔ جناب حکیم یوسف حسین خاں نے عنوان کا تعارف کرایا۔ جناب مخدوم محی الدین نے کہا کہ مشاعرے کا مستقبل اردو کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی کامیابی کا انحصار فنکار اور سامعین کے تضادات کی کمی بیشی پر ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کچھ تجویزیں بھی پیش کیں۔ جناب میر حسن نے مشاعرہ کو ایک عظیم الشان ادارہ قرار دیا جو زبان و ادب کی اچھی قدروں کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گجراتی، مراٹھی اور پنجابی زبانوں میں بھی اس کا رواج چل پڑا ہے۔ انھوں نے مشاعرے کو موضوعاتی بنانے اور داد کی روایت کو فروغ دینے پر زور دیا۔ جناب ابن احمد تاب نے کہا کہ عام مشاعرے بہ نسبت مخصوص محفلیں زیادہ مفید ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ تفریح یا ہوٹنگ کے بجائے مشاعرے سے استفادہ حاصل کریں۔ اختر حسن صاحب نے تفصیل سے مشاعرے کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور کہا کہ کوئی تنظیم یا کچھ لوگ کسی اعلان نامے یا حکم کے ذریعہ مشاعرے کی روایت کو نہیں بدل سکتے بلکہ وقت ہی روایت کو بناتا یا بگاڑتا ہے۔

سمپوزیم سے پہلے جناب وقار خلیل نے احتشام حسین صاحب سے اپنا انٹرویو "یو۔ پی میں اردو کے مسائل" پیش کیا۔ رفعت صدیقی اور اعظم راہی نے اپنے تازہ افسانے سنائے۔ رؤف خلش کے شکریہ پر یہ دلچسپ اور مفید ادبی نشست اختتام کو پہنچی۔

(حسن فرخ معتمد عمومی ادارۂ مصنفین نو، حیدرآباد)

ماہنامہ صبا کا مخدوم نمبر

حیدرآباد کا ادبی جریدہ "صبا" جشن مخدوم کے موقع پر اپنا ایک خصوصی نمبر پیش کرنے والا ہے۔ جس میں مخدوم محی الدین کی ادبی و سماجی زندگی، ان کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس ضخیم و جمیل نمبر کی قیمت چار روپیہ ہے۔ اس کے مرتب سلیمان اریب ہیں۔

وحید اختر

۴۲ بیالیس نظمیں — ایک تبصرہ

پروفیسر کلیم الدین احمد ہمارے ان ناقدین میں سے ہیں جنھوں نے تنقیدی سرمایے میں خاصا اضافہ کیا ہے اور ان کے انداز نقد و نظر سے اختلاف کے باوجود ان کے وسیع مطالعے، محنت اور باریک بینی کا اعتراف نہ کرنا بے جا ہوگا۔ ادب میں ان کی تنقیدی کاوشوں کو انتہا پسندی کے رد عمل اور مغربی ادب کے مقابلے میں مشرقی ادب کو غریب ٹھیرانے اور مغربی تنقید کے اصولوں کا اطلاق ادب کی مختلف اصناف پر یکسانی اطلاق کی وجہ سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ انھوں نے چونکایا بھی، سنسنی بھی پیدا کی اور اپنی مخالفانہ تنقیدوں سے اعتراضات کو دعوت بھی دی۔ ان کے خیال میں اردو میں تنقید کی مثال معشوق کی موہوم کمر اور اقلیدس کے فرضی نقطے کی سی ہے۔ غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے اور نظم بھی اپنے الجھاؤ، بکھراؤ، ڈھیلے ڈھالے پن، سطحیت اور مصنوعیت کی وجہ سے قریب قریب نیم وحشی ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ اپنی ان رایوں کی بنیاد انھوں نے نقد و شعر کے جن بلند عالمی معیاروں پر رکھی ہے ان کو دیکھتے ہوئے ہم کلیم الدین احمد صاحب سے بجا طور پر توقع کر سکتے تھے کہ اگر وہ نظم کے میدان میں قدم رکھیں گے تو ان کی تخلیقی کاوشیں اردو نظم کی بے مائگی کے لیے سرمایۂ فخر، نظم کی ہیئت اور فن کے تقاضوں سے بے خبر شاعروں کے لیے ایک مثالی نمونہ اور کم پڑھے لکھے روایتی انداز میں شاعری کرنے والوں کے لیے گہرائی، بلاغت اور معنویت کا درس ہوں گی۔ اس لحاظ سے اتنے سخت گیر اور کڑے نقاد کا شعر کی دنیا میں قدم رکھنا ایک مبارک فال ہے اور اسی لحاظ سے ہم نے ان کی نظموں کے پہلے مجموعے "۴۲ نظمیں" کا خیر مقدم کیا۔ "۴۲ نظموں" کی اشاعت اور اس تبصرے کی تحریر کی درمیانی مختصر سی مدت میں ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ "۴۲ نظمیں" بھی شائع ہو چکا ہے جو ان کی زود گوئی اور قادر الکلامی کا اچھا ثبوت ہے۔

۴۲ نظمیں تقریباً ڈھائی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں کچھ نظمیں مختصر ہیں اور کچھ طویل۔ ان نظموں کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ مختصر اور طویل نظم کے فرق، موضوع اور ہیئت کے تقاضوں کی طرف ایک سرسری اشارہ کر دیا جائے۔ قریب قریب اردو کی نظم کا کلاسیکی سرمایہ مثنوی، قصیدہ، ہجو، مرثیہ، مسلسل غزل اور قطعات پر پھیلا ہوا ہے۔ آج جس صنف کو ہم نظم کہتے ہیں اس کا سراغ قطعات میں مل سکتا ہے یا پھر نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں۔ نظم کا موجودہ تصور بڑی حد تک مغربی ادب سے ہمارے یہاں آیا اور اس کے ارتقا کے لیے ہماری ان پرانی اصناف نے زمین فراہم کی۔ حالی، محمد حسین آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی نے نظم کو نظم بنایا اور اقبال نے اس تعمیر کو فکر کی بنیاد عطا کی۔ جوش، رومانی شاعروں اور ترقی پسندوں نے ہیئت اور موضوع کے نت نئے تجربے کیے اور اس طرح سو سال سے کم کی قلیل مدت میں ہماری نظم ان تمام میلانات اور رجحانوں سے روشناس ہو گئی جن کی تکمیل و ترقی میں مغربی شاعری کو کئی سو سال کی محنت کرنی پڑی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی سے جوش تک ہماری نظم اردو کی کلاسیکی اصناف کے حدود میں بری طرح جکڑی رہی۔ شرر نے کچھ تجربے ضرور کیے مگر ان کی اہمیت محض تاریخی ہے۔ ہمارے سب سے بڑے نظم نگار شاعر اقبال کی بیشتر نظمیں بھی نظم کے موجودہ فارم کے تقاضوں کی بہت کم تکمیل کرتی ہیں۔ اقبال اور جوش دونوں کے یہاں فارم کا کوئی تصور نہیں۔ یہ دونوں قصیدہ نما نظمیں لکھتے ہیں جن میں الجھاؤ بھی ہے اور بکھراؤ بھی۔ فارم کے لحاظ سے یہ نظمیں بہت ڈھیلی ڈھالی ہیں۔ درمیان سے کئی اشعار یا کئی بند حذف کر دیے جائیں تب بھی نظم کے بنیادی خیال اور اس کے ارتقا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کم و بیش یہی حال رومانی شاعروں (اختر شیرانی، حفیظ، ساغر وغیرہ) اور ترقی پسندی کے ابتدائی دور کی نظموں کا بھی ہے۔ جوش کے یہاں یہ عیب زیادہ نمایاں ہے۔ ایسی نظموں کا انداز وہ ہے جس کے لیے انیس نے کہا تھا ع

اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نظم گٹھی ہوئی نہیں رہ پاتی۔ خیال کا ارتقا عمودی نہیں ہوتا بلکہ نظم کا پھیلاؤ افقی ہوتا ہے جس کی وجہ سے بنیادی خیال اور تاثر پھیل کر بکھر جاتے ہیں۔ شاعر اصل شاہراہ پر آگے بڑھنے کے بجائے اطراف میں پھیلی ہوئی پگڈنڈیوں کے جال میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے کلیم صاحب کا اردو نظم اور نظم گویوں پر اعتراض بڑی حد تک حق بجانب ہے۔ لیکن اس فنی سقم سے قطع نظر اردو نظم کا دامن اتنا تہی مایہ بھی نہیں جتنا کلیم الدین صاحب نے اسے ٹھیرایا ہے۔ آج اردو نظم کا دامن ہر رنگ کے پھولوں سے بھرا ہوا ہے اور جدید نظم فنی پختگی کو پہنچ کر طرز بیان، موضوع، مواد اور ہیئت کے نئے امکانات کو پرکھ اور برت رہی ہے۔

جس طرح مختصر نظم کو خیال اور تاثر کی ایک گٹھی ہوئی وحدت ہونا چاہیے جس میں غیر ضروری خیالات، تاثرات اور زوائد، خوبصورت مصرعوں کی گنجائش نہیں ہوتی اور خیال، تاثر اور منطق کے سہارے آگے بڑھ کر نقطۂ عروج تک پہنچتا ہے اور اپنے خاتمے پر ایک دنیائے معانی کی طرف واضح یا مبہم اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح طویل نظم کو بھی ایک وحدت ہی ہونا چاہیے۔ کوئی نظم طویل محض اس لیے نہیں ہو جاتی کہ شاعر نے دس بیس مصرعوں کے بجائے سو دو سو یا دو سو مصرعوں کی ایک بے ہنگم عمارت کھڑی کر دی ہے۔ طویل نظم کا آرٹ تعمیر و ترتیب کا آرٹ ہے۔ اس کا موضوع ہی طوالت کا متقاضی ہوتا ہے اسی لیے اس کا کینوس مختصر نظم کے مقابلے میں وسیع ہوتا ہے۔ مختصر نظم اشاروں کی زبان میں بات کرتی ہے۔ غزل کی طرح مختصر نظم ایجاز و اشاریت کی زبان سے کام لیتی ہے۔ طویل نظم ناول یا ایپک کی طرح جزئیات اور وضاحتوں کی بھی گنجائش رکھتی ہے۔ اس میں خیال یا مرکزی تاثر کو ابھارنے کے لیے اس کے متعلقہ گوشوں پر بھی روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ اس کے مختلف حصے بذات خود مستقل نظم ہوتے ہوئے بھی ایک وحدت کے اجزا ہوتے ہیں۔ خیال کا تسلسل اور ارتقا یہاں بھی ضروری ہے اور غیر ضروری تفصیلات یہاں بھی ممنوع ہیں۔ مجموعی طور پر طویل نظم کی زبان کو بھی اشاریتی ہونا چاہیے۔ واقعہ نگاری یا جزئیات بھی طویل نظم کی عظیم الشان عمارت کے لیے خام مواد کا کام دیتی ہیں۔ نظم خواہ مختصر ہو یا طویل، ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے والی قادر الکلامی نہیں بلکہ فکر، جذبے، تخیل اور فنی تقاضوں کی یکجائی کے تناسب سے عبارت ہے۔

میں نظم (مختصر اور طویل) کا یہی مفہوم سمجھتا ہوں۔ کلیم الدین صاحب ...

---

۴۲ نظمیں — کلیم الدین احمد صاحب، ناشر: [illegible] قیمت [illegible]

ادبیات کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ ان کی نظر زیادہ وسیع اور نظم کے تقاضوں یا آداب سے زیادہ آشنا ہے۔ نظم کی کوئی بھی تعریف کی جائے یا اس کا کوئی بھی تصور کیا جائے وہ بیشتر نظم نگار شاعروں سے زیادہ انھیں سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتے ہیں پھر ان کے سامنے انگریزی زبان میں نظم کا وسیع تنوع اور ہر لحاظ سے قابل قدر سرمایہ بھی ہے اس لیے وہ اردو کی شاعری اور بالخصوص نظم پر تنقید کرتے ہوئے ان تمام معیاروں اور بلندیوں کو سامنے رکھ کر حکم لگاتے رہے ہیں جن کی تکمیل میں ہماری نظم اپنی نارسائی اور ناپختگی کا اعتراف کرتی ہے اگر کوئی اور شاعر ہوتا تو ہم رسمی طور پر تبصرہ کر کے اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے لیکن کلیم الدین صاحب نے نقد و نظر میں جس بلند نگاہی کا ثبوت دیا ہے اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ ہم انہی کے معیاروں پر ان کی نظموں کو بھی پرکھنے کی کوشش کریں۔

فنی پختگی کی تلاش میں دو سو چالیس صفحات کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ نظموں میں یہ تلاش روایتی معشوق کی کمر یا اقلیدس نقطے کے حدود اربعہ کی تلاش کے مترادف ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ مختصر نظمیں نسبتاً بہتر ہیں لیکن ان کا انداز روایتی ہے اور جس رومانی دور کے اردو شاعروں اور ان کی نظموں کی یاد دلاتا ہے جب ہماری نظم گھٹنیوں چلنا سیکھ رہی تھی ان کے موضوعات میں بھی کوئی تازگی، ندرت اور فکری پختگی کا سراغ نہیں ملتا۔ طویل نظموں میں خیال منتشر ہو کر غیر ضروری، اکثر و بیشتر سپاٹ اور ڈھیلے ڈھالے سست رو مصرعوں میں الجھ گیا ہے الفاظ کے انتخاب و استعمال میں بھی کوئی خاص سلیقہ اور قدرت نظر نہیں آتی کہیں کہیں تو دوسرے شاعروں کے مصرعے بھی حرف بہ حرف یا ایک دو لفظوں کی تحریف کے ساتھ تبرکاً نظم میں ادھر ادھر اٹکے ہوئے ملتے ہیں ایک جگہ حالی ان نظموں کے کاغذی پیرہن میں فریادی نظر آتے ہیں وہی حالی جن کے لیے کلیم الدین صاحب کا خیال ہے:

"خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط۔ یہ تھی حالی کی کائنات"

کلیم صاحب جو بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں سانس لے رہے ہیں اور جو بخوبی واقف ہیں کہ انسانی علم حالی کے زمانے سے بہت آگے بڑھ چکا ہے اور نظر فنی لحاظ سے ہزاروں میل کا سفر طے کر چکی ہے اگر اپنے غیر ماخوذ خیالات لامحدود واقفیت، گہری نظر، غیر معمولی فہم و ادراک، کافی غور و فکر، اعلیٰ تمیز، بلند دماغ و شخصیت کے اظہار کے لیے بیچارے حالی کے مصرعوں کو ذریعہ بنائیں تو یہ ان کی شان کے شایاں نہیں اور ہمارے اور حالی کے لیے بڑے عبرت ہے۔

الفاظ کے استعمال میں کلیم صاحب نے جس فضول خرچی اور بے احتیاطی کا ثبوت دیا ہے اس کی صرف ایک مثال ان کی طویل نظم "وہ دیکھو ابر تیز رو" سے دینا کافی ہوگا۔ اس نظم کی طوالت میں اس طرح کے مصرعوں کا بڑا ہاتھ ہے

نظروں کا اس کو ہار دوں
بہار زندگی ان بھی دوں
یہ پیار نذر اس کو دوں
نگار آسماں بھی دوں
زمیں بھی اس کو نذر دوں
فلک بھی اس کو نذر دوں
یہ آنکھیں اس کو نذر دوں
یہ دل بھی اس کو نذر دوں
یہ جاں بھی اس کو نذر دوں

غضب کی یہ چمک ہے کیوں
غضب کی یہ کڑک ہے کیوں
غضب کی یہ گرج ہے کیوں

زمیں کو بھی لٹا دیا
فلک کو بھی لٹا دیا
خدا کو بھی لٹا دیا

ملا سکیں ہیں ہر گھڑی
نہ مل سکیں ہیں ہر گھڑی
ندا سکیں ہیں ہر گھڑی

ایک ہی نظم سے مثال کے لیے صرف چند مصرعے دئے گئے ہیں یہ اور دوسری طویل اور طویل ہی نہیں بعض مختصر نظمیں بھی اس طرح کے مصرعوں سے (جن میں ایک آدھ لفظ کے بدلنے سے مصرعے بنتے چلے گئے ہیں) بھری ہوئی ہیں کلیم صاحب سے ہم توقع کر سکتے تھے کہ وہ "ردیف و قافیہ" کے سہارے چلنے والے روایتی غزل گویوں کی طرح مصرعے گھڑتے نہیں رہیں گے یہاں تو ردیف و قافیہ کی جکڑبندی بھی نہیں اور زبان کا استادانہ استعمال بھی نہیں چند مثالیں الفاظ کے بے محل یا غیر ضروری استعمال کے سلسلے میں ادھر ادھر سے دیکھتے چلیے گا۔

چلی جا رہی تھی، چلی جا رہی ہے   یہ دنیا کی کشتی کدھر جا رہی ہے

چاندنی فضاؤں میں   نور پھیل جاتا ہے

(چاندنی کو فضا کے لیے صفت بنانا محل نظر ہے یہاں چاندنی سیمیں کے معنوں میں آیا ہے)

ان کا بس یہ شیوہ ہے
عاشقی و جاں بازی

(بس یہ عجز بیان پر دلالت کرتا ہے)

یہ دیکھو ننھی ننھی سی شبنم
اداسی اداسی سی چھا رہی ہے

(ایک "ننھی" اور ایک "اداسی" زائد ہے)

کتنی طویل ہیں اللہ   انتظار کی گھڑیاں

(دراز کا استعمال "طویل" کی جگہ محل نظر ہے)

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

انتساب

صلاح الدین نیر

مری کتاب کا جب تم نے نام رکھا تھا
تمہیں تو یاد نہ ہوگا مجھے ہے یاد اب تک
ہر ایک شعر غزل کا تمہارے ہونٹوں پر
نسیم صبح کی مانند جھوم جاتا تھا
چمن میں از سرِ نو پھر بہار آئی تھی
"دیارِ حسن" میں تازہ پھول مہکے تھے
کنول وفا کے سرِ شام مسکرائے تھے
چراغ مہر و وفا پھر سے جگمگائے تھے
مری حیات کا وہ زخم ہے گلِ تازہ
تم آج دیکھ رہی ہو کہ اس کی خوشبو سے
"دیارِ حسن و محبت" مہکتا رہتا ہے
ہر ایک لفظ وفا دل کی بات کہتا ہے

اداس لمحوں میں جب مجھ کو یاد آتی ہو
تمہاری یاد کو پہلو میں ساتھ ساتھ لیے
میں اس مقام پہ جاتا ہوں لڑکھڑاتے ہوئے
جہاں وفا کے کئی پھول مسکرائے تھے
جہاں حیات کے لمحے قریب آئے تھے
"شگفتہ دل" جہاں دانستہ چوٹ کھائے تھے

تمہیں یقین نہ آئے گا لیکن اب بھی وہاں
تمہارے قدموں کے تازہ نشان ملتے ہیں
"دیارِ شوق" کی مانوس ان فضاؤں میں
مہکتے مچلتے جذبات لہلہاتے ہیں
تمہاری سانسوں کی خوشبو مہکتی رہتی ہے
تمہاری نقرئی آواز اب بھی گونجتی ہے

زمانہ بیت گیا رت بدل گئی لیکن
تمہاری یاد ہے تازہ شگفتہ گل کی طرح
وہ لمحے آج بھی نظروں میں پھر رہے ہیں
وہ دن ہمیشہ مرے پاس پاس رہتے ہیں
تم آج پاس نہیں پھر بھی ایسا لگتا ہے
کوئی تو ہے جو مرے ساتھ ساتھ رہتا ہے
اسی ادا سے مرے پاس آ کے بیٹھی ہو
اسی ادا سے مرے ساتھ گھومتی پھرتی ہو
وہ لمحے چاہ کے بھی میں بھلا نہیں سکتا
"نیا چراغ" کوئی پھر جلا نہیں سکتا

غزلیں

جے کرشن چودھری حبیب

حسین خواب نہیں کوئی زندگی کی طرح
کوئی سراب جہاں میں نہیں خوشی کی طرح

فضا میں تیرے تبسم نے کلیاں بکھرا دیں
چمک اٹھے ہیں اندھیرے بھی روشنی کی طرح

شبِ فراق کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں
تم آ گئے مرے آنگن میں چاندنی کی طرح

نسیمِ صبح کی شبنم کی فرحتیں لے کر
تم آئے میرے تصور میں تازگی کی طرح

ہے آرزو سے تری زندگی مری رقصاں
ہے دل میں پیار ترا روح کی نغمگی کی طرح

وہی ہے شوق کا جذبہ وہی ہے عجز و نیاز
کہ دیکھ لینا ابھی تجھ کو ہے بندگی کی طرح

مجھے پسند نہیں ہنگامۂ جہاں واعظ
یہ زندگی نہیں جنت کی بے حسی کی طرح

کبھی وہ آئیں کبھی آ کے پھول برسائیں
وہ بھولی بسری سی یادیں ہیں زندگی کی طرح

حبیب اپنی غزل میں بھی ہو وہ سوز و گداز
جو دل کو موہ لے کاہن کی بانسری کی طرح

نظر صہبائی

سورج نے آنکھ کھولی سحر جاگنے لگی
نیند اپنی ایک چاند کی پیالی میں کھو گئی

انسان خود اپنے واسطے آسیب ہو گیا
رنگین ہے لہو سے زمیں ویت نام کی

سب خواب رات مرے بستر میں رہ گئے
دن لے گیا سمیٹ کے سب خوبصورتی

ہر زاویے سے فکر کے دیکھو مفکرو!
کن دائروں میں الجھی ہوئی ہے یہ زندگی

تاریک تر خلاؤں کی تاریک راہ پر
بے خوف ہی ازل سے سفر میں ہے روشنی

بیٹھی ہوئی ہیں یادیں خیالوں کی برج پر
تخئیل کے گلاس میں ہے دردِ زندگی

یوں جی رہے ہیں لوگ نظر شہرِ زیست میں
آنکھوں میں شوخ رنگ ہے چہرے پہ تازگی

ا۔و۔ افضل

نشّہ دور میں ہے گردشِ ایام کے ساتھ
رقص کرتی ہیں نگاہیں مری ہر جام کے ساتھ

میں ہوں شاداب نہ سحر و شام کے ساتھ
دن کا ہر دور رہا گردشِ ایام کے ساتھ

کہہ دیا ایک تمنائے شوق نے ابہام کے ساتھ
جلوے پردے میں چھپے جاتے ہیں الزام کے ساتھ

کیوں نہ تجھ پہ کرے وقت کی صیادی کا
آشیانہ بھی لیے پھرتا ہے یہ دام کے ساتھ

کھل گئی ہے نہاں تھیں جو ہوس کی حقیقت افضل
لوگ ویرانوں میں رہتے ہیں در و بام کے ساتھ

شمس طہرانی

الفت پڑی جب بھرم پر ہم نے سب پہچانے لوگ
اپنے ہی اکثر ایسے ملے ہیں جیسے ہیں بیگانے لوگ

راہِ محبت میں اپنا گھر بار لٹائے بیٹھے ہیں
ہم سے لگی کی بات نہ پوچھو آئے بہت سمجھانے لوگ

ہم نے اپنی راہ بدل دی مے خانے میں
شیخ و برہمن کی صورت میں آئے بہت بہکانے لوگ

محفل کا ہر کار یہی پورے ہیں باتیں
پوچھا گیا یار غم کو آتے ہیں تڑپانے لوگ

کہتے حسین حمید ہوئے کتنے منصور چڑھے سولی
لیکن ایک حرفِ حق کو آتے ہیں جھٹلانے لوگ

عصرِ رواں کے دکھ ہیں ان کی سب کو حقیقت معلوم
کون انہیں سمجھائے ان سے ہیں جو بیگانے لوگ

خوش ہو گئی دنیا جی ہوئے دیوانی اور کار
زلفِ حیات الجھی ہے اب آئے ہیں سلجھانے لوگ

رات جب ان کی بزم میں شمسی میری وفا کا ذکر ہوا
شمس کہے دو بول سے تھا جو تو ہوئے آپ ہی دیوانے لوگ

اصغر عباس

زبان گل سے حسن یار کی تفسیر

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزی دور حکومت سے بے شمار خامیوں کے باوجود بعض خوبیوں کا بھی حامل تھا اور اگر ان خوبیوں کو تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ انگریزی حکومت نے ہندوستان کو مغربی نظام تعلیم، سائنسی انداز فکر اور جمہوری زاویۂ نگاہ سے آشنا کرایا۔ جس کا عملی اظہار علی گڑھ تحریک اور مدرسۃ العلوم میں ہوا۔ ذیل میں ہم مدرسۃ العلوم کی تاسیس کی داستان سرسید اور ان کے برگزیدہ رفقاء کی زبانی سناتے ہیں کہانی طویل اور دلچسپ ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ یہ نہ کہہ پڑیں کہ "سود اخدا کے واسطے کر قصہ مختصر" اس لیے جہاں تہاں سے ضروری اقتباسات لیے گئے ہیں جو اخبار سائنٹیفک سوسائٹی سے ماخوذ ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایم۔ اے۔ او کالج اور علی گڑھ تحریک کی رفتار سفر انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی فائلوں میں محفوظ ہے۔ اس کے مطالعے سے بہت سے نئے گوشے اور حقائق نگاہ کے سامنے آتے ہیں جن کی طرف حالی نے حیات جاوید میں مبہم اشارے کئے تھے۔ مدرسۃ العلوم کا جو خاکہ سرسید کے ذہن میں تھا اس میں رنگ سید محمود کی بھائی بیلہ کے باعث آیا۔ ذیل میں ہم سید محمود کے مضمون یونیورسٹی کیمبرج سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداً سید محمود ہی نے علی گڑھ میں مدرسے کے قیام کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مگر سب سے مقدم بات یہ ہے کہ ایک بڑا مدرسہ کسی عمدہ شہر میں قائم کیا جاوے جس میں کہ طالب علم اس اصول پر تعلیم پاویں جیسا کہ اس یونیورسٹی میں یعنی یہ کہ مدرسہ میں رہنا ہو اور سب ساتھ کھانا کھاویں اور طالب علم الگ الگ دو دو کمرے لے کر رہیں اور یہ کہ علوم سب زبان اردو میں پڑھائے جاویں اور انگریزی صرف بطور ایک زبان غیر کے پڑھائی جاوے بلکہ یہ کہ جس کا دل چاہے پڑھے اور جس کا دل چاہے نہ پڑھے اور جس کا دل چاہے عربی و فارسی میں تکمیل کرے جس کا دل چاہے دین کے علوم تحصیل کرے غرض یہ ہے کہ ایک ایسا مدرسہ ہو جہاں کہ صرف مسلمان اپنی حسب خواہش تعلیم پا سکیں اور اپنے دین کی تعلیم بھی شامل رکھیں۔

فرض کیجیے کہ علی گڑھ میں یہ مدرسہ قائم ہو تو اس میں کچھ شک نہیں کہ وہاں ہندوستان کے سب طرف سے مسلمان بآسانی آ سکتے ہیں پنجاب اور اودھ اور بہار سب سے ریل علی گڑھ کو جاتی ہے اور سفر کی کچھ دشواری نہیں۔"

اس سلسلے میں سرسید کے ان جملوں کو بھی اگر ذہن میں رکھا جائے تو سید محمود کے کارنامے زیادہ واضح اور روشن نظر آنے لگتے ہیں۔

"میں سید محمود کا نہایت شکر گزار ہوں کہ تمام واقفیت اور اطلاعیں جو مجھ کو حاصل ہوئیں اس میں سید محمود نے میری بہت بڑی مدد کی مجھ کو اس بات کے اقرار کرنے سے بڑی خوشی ہے کہ اگر ان کی مدد نہ ہوتی تو جس مقصد سے میں لندن گیا تھا میرا جانا فضول تھا مدرسہ کے بورڈنگ ہوس اور تعلیم کے طریقہ کی جس پر اس وقت مدرسہ چل رہا ہے اور جس پر آئندہ چلے گا ان کی نسبت یہ کہنا کہ میں ان کا تجویز کرنے والا اور قرار دینے والا تھا ایک ناانصافی ہوگی بلکہ صاف صاف کہنا چاہیے کہ اس کا بہت بڑا حصہ سید محمود کا تجویز کیا ہوا تھا۔"

(تقریر ۲۸ر دسمبر ۱۸۸۹ء جلسہ اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی)

گزٹ میں سید محمود کا مضمون "یونیورسٹی کیمبرج" دیکھنے کے بعد "ایک غریب مسلمان" نے گزٹ کے ایڈیٹر کو خط لکھا تھا جس میں مدرسۃ العلوم کے محل وقوع کے لیے لکھنؤ کو بہتر اور افضل بتایا گیا تھا چنانچہ سرسید نے ۱۹ر جولائی کے گزٹ میں عامۃ الناس سے یہ رائے طلب کی تھی کہ مدرسۃ العلوم کی تاسیس کہاں ہو۔ اشتہار ان الفاظ میں تھا۔

"مگر اس بات کی تجویز کرنی ہے کہ کس شہر میں اس مدرسہ کا قائم ہونا مناسب ہے اور ارادہ ہے کہ اس مدرسہ کے مقام کا تصفیہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کی رائے دریافت کرنے کے بعد کیا جاوے اس لیے یہ اشتہار دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں سے جس کا دل چاہے اس بات میں اپنی رائے لکھ کر راقم آثم کے پاس بمقام بنارس بھیجدے وہ سب رائیں کمیٹی میں پیش ہوں گی مگر جو شہر اس کے لیے پسند کیا جاوے اس کی ترجیح کی وجوہات بھی ارقام ہوں۔"

اس اشتہار کے بعد گزٹ میں مختلف لوگوں کے خطوط شائع ہوئے جن میں مدرسہ کے قیام کے لیے الہ آباد، کانپور، آگرہ، دلی، لکھنؤ، اور مرادآباد وغیرہ کا نام لیا گیا سید ظہور حسین وکیل الہ آباد ہائی کورٹ نے تو یہ بھی پیشکش کی تھی کہ اگر مدرسہ مرادآباد میں قائم ہوا تو ۲۴۰ بیگھہ زمین بھی دیں گے اور امداد کے طور پر سالانہ ایک زر خطیر بھی۔ حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ "اس اشتہار پر مختلف رائیں لوگوں نے ظاہر کیں مگر سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جنھوں نے علی گڑھ کو ترجیح دی تھی۔" چنانچہ نواب وقار الملک اور حالی نے بھی علی گڑھ میں مدرسے کے قیام کی تحریک کی تائید کی تھی۔ ذیل میں ہم ان دونوں بزرگوں کے مکاتیب پیش کرتے ہیں۔

"بعالی خدمت۔ جناب مولوی سید احمد خان صاحب بہادر سی ایس آئی سکریٹری و بانی کمیٹی ترقی خواہ تعلیم مسلمانان ہندوستان سلامت

تسلیم۔ میں نے آپ کا اشتہار اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ

مطبوعہ ۱۹؍جولائی ۱۸۷۲ء میں دیکھا جس میں آپ نے عام رائیں اس باب میں طلب کی ہیں کہ ممالک مغربی و شمالی میں مسلمانوں کا وہ مدرسۃ العلوم جس کے واسطے کمیٹی خازن البضاعۃ روپیہ جمع کر رہی ہے کس مقام پر ہونا چاہیئے میں بھی اپنی ایک ناقص اور عاجزانہ رائے اس باب میں کمیٹی میں پیش کرتا ہوں میں اس خط کی ایک نقل اخبار سائنٹیفک سوسائٹی میں بھی چھپنے کے واسطے بھیجوں گا اور اس میں میں نے (نمبر ۱) ڈال دیا ہے اور میرے نزدیک یہ مناسب ہے کہ جس قدر خطوط یا چٹھیاں اس معاملہ میں کمیٹی کے پاس آویں ان سب کو نمبروار اخبار میں چھاپ دیا کیجئے تاکہ ان عام رایوں سے تمام مسلمان آگاہ ہو جاویں اور ان پر ایک معقول بحث بھی ہو جاوے اور اس تدبیر سے میں یہ بھی امید کرتا ہوں کہ بہت سے مسلمانوں کو اس معاملہ میں اپنی رائیں ظاہر کرنے کا شوق پیدا ہوگا اور جو مقصد اس بات سے آپ کا ہے وہ پورا پورا حاصل ہو جاوے گا۔ آمدم بر مطلب

میرے نزدیک اس معاملہ میں علی گڑھ کو بہت سی وجوہات سے اور مقامات پر ترجیح حاصل ہے جن میں سے سب سے اول اس کی آب و ہوا کی عمدگی ہے۔

اس مدرسے کو یہی غرض نہیں ہے کہ جس مقام پر وہ قائم ہو اسی مقام کے باشندے اس میں تعلیم پاویں اس مدرسہ میں تمام ممالک مغربی و شمالی بلکہ پنجاب اور اودھ بنگالہ و ممالک دکن و دیگر تمام حصص ہندوستان کے مسلمان طالب علم تعلیم پاسکیں گے مختلف علاقوں کے رہنے والے جو مختلف مزاج رکھتے ہوں گے اس میں داخل ہوں گے پس سب سے مقدم احتیاط اس مقام کے منتخب کرنے میں یہی ہونی چاہیئے کہ آب و ہوا اس مقام کی نہایت معتدل اور نہایت عمدہ ہو اور میری دانست میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو اس بات سے انکار کرے کہ علی گڑھ کی آب و ہوا تمام مختلف موسموں میں بہ نسبت اور مقامات ممالک مغربی و شمالی کے نہایت عمدہ رہتی ہے۔ نقشہ کے معاینہ سے صاف معلوم ہوگا کہ میان دوآب میں یہ مقام ایسے عمدہ موقع پر واقع ہے کہ اس سے بہتر کمتر کوئی مقام خیال میں آسکے گا اس کے شمال میں جس قدر فاصلہ سے دریائے گنگ واقع ہے قریب قریب اسی قدر فاصلہ پر دریائے جمن بہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر موسم میں اس مقام کی آب و ہوا کا اعتدال قائم رہتا ہے جس سے یقین ہوتا ہے کہ خواہ کسی حصہ سے ہندوستان کا باشندہ یہاں آکر قیام کرے خدا کے فضل و کرم سے وہ ہر طرح قوی اور تندرست رہے گا اور جو طالب علموں کے شغلوں کے واسطے اور ان کے اولیا اور سرپرستوں کی اطمینان خاطر کی غرض سے نہایت ضروری ہے۔

دوم عمدگی موقع و مقام۔ علی گڑھ کا موقع بھی ممالک مغربی و شمالی میں مسلمانوں کے مدرسہ اعظم کے واسطے نہایت عمدہ ہے اس کے قریب ہی تھوڑے فاصلہ پر ہندوستان کا قدیم دارالعلوم یعنی دہلی ہے جس میں اب تک بھی مسلمانوں کے بہت سے شریف خاندان موجود ہیں علی گڑھ سے گوشہ شمال و مغرب میں اس ملک کے بڑے بڑے شہر میرٹھ اور سہارنپور اور مسلمانوں کی مختلف بستیاں واقع ہیں جہاں کے لوگ تحصیل علم کی طرف ایک خاص توجہ رکھتے ہیں اور علی گڑھ سے مشرق میں آگرہ و کانپور و لکھنؤ وغیرہ آباد ہیں اور اسی لین پر الہ آباد ہے اور ان سب مقامات سے جن کا اوپر ذکر ہوا ریلوے کی ٹرینیں ہر روز دو وقت صبح و شام علی گڑھ میں آتی ہیں اور کسی قسم کی مزاحمت راستے میں نہیں ہے شمال علی گڑھ میں وہ وسیع ملک یعنی روہیلکھنڈ واقع ہے جو زمانہ سابق سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں کے شریف خاندانوں کا مخزن خیال کیا جاتا ہے ممالک مغربی و شمالی کا یہ وسیع حصہ بھی ایک جدید ریل کے ذریعہ سے علی گڑھ سے مل گیا ہے اور روہیلکھنڈ ریلوے کی ایک شاخ خاص علی گڑھ سے روہیلکھنڈ میں داخل ہوئی ہے اور چندوسی سے اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں ایک شاخ بدایوں کے ضلع میں ہو کر بریلی اور شاہجہانپور وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں گزری ہے اور اودھ کو چلی گئی ہے۔ دوسری شاخ چندوسی سے مرادآباد کے ضلع میں پہونچی ہے جہاں سے رامپور بھی بہت ہی نزدیک ہے یہ آخر الذکر شاخ اور بھی آگے کو بڑھے گی اور بجنور کے ضلع میں ہوتی ہوئی اور کسی مقام پر دریائے گنگ پر گذرتی ہوئی رڑکی کے قریب و جوار میں پنجاب ریلوے سے مل جاوے گی بس ریل کی اس کیفیت کے لحاظ سے علی گڑھ تمام روہیلکھنڈ کے واسطے اب بمنزلہ ایک صدر دروازہ کے شمار ہوتا ہے روہیلکھنڈ میں مسلمان شریف خاندانوں کی تعداد جو ہمیشہ علم کی قدر و منزلت کرتے چلے آئے ہیں اور اس کے شائق ہیں اس کثرت سے ہے کہ ان کے ہموطن وہ اہل ہنود جن میں علم کا کچھ چرچا ہے مشکل سے اپنے واسطے مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک تہائی بلکہ ایک چوتھائی کی نسبت قائم کرسکتے ہیں پس نہایت ضرور ہے کہ یہ مدرسہ اعظم علی گڑھ ہی میں قائم کیا جاوے جس سے بہتر کوئی مقام ان ممالک میں خیال میں نہیں آسکتا۔ (باقی آئندہ)

سفیر اختر صدیقی

لندن میں اُردو

بہت سے دوستوں کا اصرار ہے کہ اردو کے بارے میں کچھ لکھوں، اردو کے ساتھ آج کل ظلم یہ ہو رہا ہے کہ ہر جگہ اس کو پاکستانی زبان سمجھا جاتا ہے بی بی سی ریڈیو پر جو اردو کا پروگرام ہوتا ہے وہ پاکستان ریڈیو کے منتخب لوگ چلاتے ہیں اور ہندی ہندوستان کے لوگ حالاں کہ کئی بار زور دیا گیا ہے کہ اردو دونوں ملکوں میں مشترکہ زبان ہے، دوسری بات یہ کہ یونیورسٹیوں میں اردو کا اسٹاف پاکستان ہی سے منتخب کیا جاتا ہے، حالاں کہ اردو ادب کے ممتاز نقاد شاعر اور ادیب ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں موجود ہیں۔ لیکن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں جو جونیر اساتذہ ہیں وہ اردو زبان کے نہ ماہر ہیں اور نہ ہی کلاسک پر انھیں مہارت ہے۔ اس وجہ سے یونیورسٹی کے طلبا میں ادب اور زبان کا صحیح ذوق پیدا نہیں ہو رہا ہے۔

انگریز طلبہ علی گڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں جاکر زبان و ادب کا صحیح لطف حاصل کرتے ہیں، کئی انگریز اور یوروپین طلبہ اردو اچھی بولتے ہیں، اگرچہ لہجہ اب بھی انگریزی کا اثر رکھتا ہے رالف رسل اور میری ولیمز جن کو اب گجراتی بھی آگیا ہے عثمانیہ اور علی گڑھ ہو آئے ہیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی طالب علموں میں جو یونیورسٹی کے قریب ہیں اکثر اردو بولتے ہوئے مل جاتے ہیں، مسٹر رسل شیروانی اور میری "ساری" بھی پہننے لگی ہیں۔ اور ہندوستانی کلچر اردو طلبہ میں کافی مقبول ہے ہماری یونیورسٹی کسی شاعر کے لندن آنے پر مشاعرہ کرواتی ہے جو صرف چند پروفیسروں اور گنے چنوں کے ساتھ ہوتا ہے اور کافی مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی میں اردو طلبہ کی تعداد اچھی خاصی ہے ان میں زیادہ تر طلبہ فارن سروس میں کام کرنے کے لیے اردو سیکھ رہے ہیں یا مترجم بننے کے لیے اردو سیکھ رہے ہیں۔ صرف پی ایچ ڈی میں ہندوستان پاکستان کے طلبہ ہیں۔ یونیورسٹی کے علاوہ عام طور پر بھی برطانیہ میں اردو کی اہمیت بڑھ رہی ہے حکومت نے جب سے ہزاروں ہندوستانی پاکستانی مزدوروں کو مختلف دیہات اور علاقوں سے امپورٹ کرنا شروع کیا ہے (اس لیے کہ یہاں مزدوروں کی بے حد کمی ہوگئی ہے) سے اردو کی اہمیت و ضرورت بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ سارے لوگ اردو سمجھتے اور بولتے ہیں۔ اس لیے ایسے علاقوں اور فیکٹریوں میں جہاں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اردو اور بنگالی نوٹسیں لگی ہوئی ہیں سڑکوں تک پر بورڈ اردو میں لگے ہیں۔ پولس یا کونسل کی نوٹسیں اعلانات اردو میں بھی شائع ہوتے ہیں۔ ہر بورڈ کے مسائل حل کرنے پولس اور کونسل نے ایسے عہدہ دار ملازم رکھے ہیں جو اردو جانتے ہیں اور ہندوستانی پاکستانی ان سے بہتر طور پر مسائل طے کرا سکتے ہیں۔ مدارس میں اردو جاننے والے اساتذہ کو ملازم رکھا جا رہا ہے تاکہ ہندوستانی پاکستانی بچوں کو بخوبی پڑھا سکیں۔ انگریزی زبان سکھانے کے لیے بچوں اور بڑوں کے لیے اردو جاننے والے اساتذہ ہیں۔ ہر روز اردو کی ضرورت ہر شعبہ میں بڑھتی جا رہی ہے۔ بی بی سی ٹیلی ویژن ہر اتوار کی صبح نو بجے تیس منٹ کا ایک پروگرام "اپنا ہی گھر سمجھیے" اردو بولنے والوں کے لیے شروع کیا ہے جس کے نگران کار مہندر کول اور سلیم شاہد ہیں اس کے علاوہ ریڈیو پر بھی روز سویرے آٹھ بجے سے اردو کے فلمی ریکارڈ سنائے جاتے ہیں جن کے ساتھ انگریزی کا درس بھی ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر اچھے کلچرل پروگرام بھی پیش ہوتے ہیں، روی شنکر کا ستار، غزلیں قوالی وغیرہ پیش کی جاتی ہیں۔

ادبی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہیں جن کے ساتھ مشاعرے، اقبال، غالب، میر کے یوم منائے جاتے ہیں۔ اس کے صدر میر بشیر ہیں، جو دنیا کے بہت بڑے ماہر نجوم ہیں اور لندن میں ان کا بزنس شاندار ہے، خود بھی شاعر اور ادیب ہیں۔ مشاعروں میں مانچسٹر اور برمنگھم سے شاعر آتے ہیں۔ حیدرآباد کے شاعروں میں عبدالقادر حبیب ان کی اہلیہ محترمہ صدیقہ شبنم اکثر مشاعروں میں پڑھتے ہیں اور کافی داد لیتے ہیں ادبی محفلوں میں افسانے تنقیدی مقالے اور خاکے پڑھے جاتے ہیں اور لوگ بڑے ذوق و شوق سے ان محفلوں میں آتے ہیں، بعض انگریز اردو طلبہ بھی شریک ہوتے ہیں اور کافی محظوظ ہوتے ہیں اب لندن سے کافی اردو اخبارات بھی شائع ہونے لگے ہیں۔ ان میں "ایشیا" "مشرق" مقبول ترین ہیں جو فوٹو آفسٹ پر ہر ہفتہ پابندی سے شائع ہوتے ہیں ان میں ہندوستان پاکستان کی خبروں کا خلاصہ، مضامین، افسانے، غزلیں سب کچھ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ معیاری نہیں کہے جا سکتے لیکن لوگوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ مقامی اشتہارات و اعلانات، لندن میں رہنے بسنے کے لیے مشورے، اشتہارات، بہرحال ایک اوسط درجہ کے عام اردو اخبار کے سارے فیچر ان میں موجود ہوتے ہیں۔ لیڈز میں کوئی نوجوان ایک اور روزنامہ نکالتے ہیں جس کی گارڈین جیسے اخبار نے خوش آمدید کیا تھا کئی مشکلات اور ناموافق حالات میں یہ نوجوان اتنا صاف ستھرا اخبار نکال رہا ہے اس کے لیے خبروں کی فراہمی کاغذ طباعت وغیرہ کے لیے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے فراہم نہ ہو سکنے کے باوجود اس نے ہمت کی اور اب پابندی سے اخبار شائع ہو رہا ہے۔ جس کی ساری انگریزی پریس نے ستائش کی ہے۔

ان رسالوں نے ہندوستانی پاکستانیوں کو نہ صرف اپنے وطن کی ساری اہم خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں بلکہ اپنی کمیونٹی کی خبریں بھی معلوم ہوتی ہیں جو انگریزی اخبار اور رسالے نہیں پڑھ سکتے۔ ان اخباروں سے وہ ساری ضروری باتیں معلوم کرتے ہیں جو برطانیہ میں زندگی گذارنے کے لیے ضروری ہیں جائداد اور شخصی مسائل پر قانونی مشورے دئے جاتے ہیں بچوں کی پڑھائی ملازمت مکان اور سفر کے بارے میں اچھی معلومات ہوتی ہیں جن سے لوگ کافی فائدہ اٹھاتے ہیں اخبار والوں نے اپنے ریڈر کا (IMAGE) ایک قابل خیر تعلیم یافتہ معصوم گنوار آدمی قرار دیا ہے اور اس کے لیے ہی وہ سارا مواد جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں بہت جلد یہاں ایک پبلیکیشن ہاؤس قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ (ماخوذ)

مراسلہ

امانت کی اندر سبھا کے بارے میں

ہماری زبان مورخہ یکم نومبر و ۸ نومبر ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کا مضمون "امانت کی اندر سبھا" پڑھا۔ عنوان پڑھ کر خیال ہوا تھا کہ یہ اندر سبھا پر کوئی علمی مضمون ہوگا۔ لیکن مضمون پڑھ کر معلوم ہوا کہ پروفیسر مسیح الزماں کی مرتبہ کتاب "امانت کی اندر سبھا" کا ایک طرح سے ریویو ہے۔

یہ اندازہ ہوا کہ عقیل صاحب نے کہیں تو کتاب کے مقدمے کے کچھ جملوں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اس طرح پیش کیا ہے کہ مرتب کی طرف غلط باتیں منسوب ہو جائیں اور کہیں جن باتوں کی مقدمہ میں وضاحت کی گئی ہے ان کے متضاد خیالات کو مرتب کی طرف منسوب کر کے مقدمہ میں لکھی ہوئی باتوں کو الفاظ بدل کر ایسے انداز سے پیش کیا گیا ہے جیسے ان کی تردید میں یہ باتیں لکھی جا رہی ہیں۔ مثال کے لیے ہماری زبان مورخہ یکم نومبر ص۳ کالم ۳ سے صفحہ چار کے خاتمہ تک عقیل صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امانت کے پہلے بھی ڈرامہ اور تھیٹر کے قسم کی کچھ چیزیں سامنے آ چکی تھیں اور گویا مرتب ان سے ناواقف ہے اور اس نے امانت کی اندر سبھا سے پہلے ڈرامے کے قسم کی کسی چیز کا ذکر نہیں کیا ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مقدمہ میں کئی جگہ ایسی کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اندر سبھا کے لیے پس منظر کا کام دے سکتی تھیں۔ مقدمہ میں ص۱۰ اور ۱۱ پر نصیر الدین حیدر کی راگنیوں کے جلسے، بھانڈوں اور بھگت بازوں کی نقلیں اور واجد علی شاہی رہس کا ذکر کرنے اور مثالیں دینے کے بعد یہ عبارت ملتی ہے:۔

"بھانڈوں اور بھگت بازوں کے تماشوں کے علاوہ اسی دور میں وہ باتیں اور ایسی نقلیں جن کا ذکر اندر سبھا کی تصنیف کے سلسلہ میں کر دینا مناسب ہے مرثیہ خوانی اور مثنوی خوانی کی مجلس ...." ص۱۱

ص۱۲ پر پھر یہ عبارت ملتی ہے:۔

"امانت نے رہس مبارک کی شہرت، اس کے ناچ گانوں کے چرچے اور اپنے عہد کے تفریحی تصورات اور رجحانات کو مد نظر رکھ کر اپنی تخلیقی قوت سے ایک ایسا جلسہ ترتیب دیا جس میں اس عہد کے تمام ناظر یا تماشائی کی تسکین کا سامان ہو۔ اس میں اس وقت کی مشہور مثنویوں کی بھی جھلک ہے جو مخصوص نشستوں میں پڑھی جاتی تھیں ان مجروں کا بھی جلوہ ہے جن کا رواج عام تھا ...." ص۱۲،۱۳

"انیسویں صدی کے نصف کے قریب جب اندر سبھا لکھی گئی اس وقت شمالی ہندوستان میں ڈرامے یا اسٹیج کی کوئی روایت نہیں تھی۔ سنسکرت ناٹکوں کی قدیم روایت ایک طرح سے مٹ چکی تھی۔ بنگال میں جاترا اور شمالی ہندوستان میں کرشن لیلائیں اور مزاحیہ خاکے کبھی کبھی اداکاروں کے ذریعہ سے پیش کیے جاتے تھے۔ متھرا کے راس دھاری، لکھنؤ کے بھگت باز اور بھانڈ ایسے تماشے ضرور کرتے تھے جنھیں ناٹک سے ملتا جلتا کہا جا سکتا ہے۔ اندر سبھا سے ہندوستانی تھیٹر کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔" ص۲۹

ایسی مثالیں تو اس مضمون میں جا بجا ہیں۔ ہماری زبان مورخہ ۸ نومبر ۱۹۶۶ء کے ص۵ کے کالم ۱ میں پہلے یہ فرض کیا گیا ہے کہ مسیح الزماں صاحب امانت کی اندر سبھا کے پلاٹ کو تمام تر امانت کے ذہن کی پیداوار سمجھتے ہیں اور پھر اس مفروضہ کو خود ہی رد کرنے کے لیے گلزار نسیم، سحر البیان اور [illegible] اردو کے قصوں کی مثالیں دی ہیں۔

اور ص۲۱ سے جو اقتباس دیا گیا ہے اس میں بھی یہ جملہ موجود ہے کہ اندر سبھا میں اس وقت کی مشہور مثنویوں کی جھلک موجود ہے۔ اس کے علاوہ اندر سبھا کے پلاٹ پر جہاں مرتب نے اپنے مقدمہ میں روشنی ڈالی ہے وہاں پھر اسی کی طرف اشارہ ہے:۔

"اس قصے میں سحر البیان، گلزار نسیم اور بعض دوسرے قصوں کے اجزا اس طرح موجود ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ملا جلا کر امانت نے اندر سبھا کا قصہ ترتیب دیا ہے" ص۳۲

مجھے ان اسباب کا پتہ نہیں جو اس تبصرے کے لکھنے کے محرک ہوئے۔ لیکن اتنا صاف پتہ چلتا ہے کہ تبصرے میں ادبی دیانت داری سے کام نہ لے کر اصل کتاب کو ایک غلط انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

(ساغر مہدی)

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے عہدیداروں اور کارکنوں کا سالانہ اجتماع

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش میں اردو کے مسائل، تعلیم اور انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی شاخوں کی کارکردگی اور آئندہ لائحہ عمل کا جائزہ لینے کے لیے اردو ہال حمایت نگر میں انجمن کی شاخوں کے صدور و معتمدین کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی نائب صدر انجمن ترقی اردو نے صدارت کی۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" نے اردو کارکنوں کے اس دو روزہ اجتماع کو انتہائی اہم قرار دیتے ہوئے اپنی تقریر میں قانون سرکاری زبان کی منظوری اور اس میں اردو کے تعین شدہ قانونی موقف کو قابل ستائش قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ سال اردو کے لیے ایسے موقف کے حصول کی جدوجہد کا مرحلہ تھا اور اب ہم نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی ہے ان کی رائے میں سرکاری زبان بل میں اردو کے موقف کی شمولیت یقیناً ایک اہم کامیابی ہے اردو کے اس متعین شدہ موقف کے بارے میں اضلاع کی شاخوں کے نمائندے اس اجلاس میں اپنے تجربات، کارکردگی ضروریات اور مسائل و مشکلات کی رپورٹ پیش کریں جس کی وجہ سے انجمن کی مختلف شاخوں کی کارکردگی سے واقفیت حاصل ہوگی۔ جناب عابد علی خاں نے بتایا کہ اس اجتماع میں مختلف اضلاع سے ۱۰۰ مندوبین حصہ لے رہے ہیں۔ شہر حیدرآباد میں اردو کے مسائل حکومت اور ارباب مقتدر کے پاس نمائندگی کے ذریعہ حل ہو رہے ہیں۔ لیکن اضلاع اور دیہی علاقوں میں ایسے مسائل ہنوز توجہ طلب اور حرکت عمل کے طالب ہیں۔ مولوی حبیب الرحمٰن معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں فرمایا کہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ ہمارا تیسرا سالانہ اجتماع ہے اور تجربہ بتلا رہا ہے کہ یہ اجتماعات ہمارے مقصد کو آگے بڑھانے میں مفید اور معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

سال گذشتہ کے اجتماع میں ہم نے آندھرا پردیش میں "یوم اردو" منانے کا فیصلہ کیا تھا، چنانچہ فروری ۱۹۹۶ء کے پہلے ہفتہ میں ریاست کے بہت سے مقامات پر خاصی کامیابی کے ساتھ "یوم اردو" منایا گیا اور سرکاری زبان کے مجوزہ مسودہ قانون میں اردو کو مناسب جگہ دینے کے لیے ایک قرارداد ان جلسوں میں منظور کی گئی جس کی کاپیاں ذمہ داران حکومت کی خدمت میں بھیجی گئیں۔ یوم اردو کے تعلق سے ہمیں صرف اس لیے خوشی نہیں ہے کہ انجمن کی اپیل پر اتنے بہت سے لوگوں نے بہت سے مقامات پر لبیک کہا بلکہ اس سے کہیں زیادہ خوشی اس بات پر ہے کہ ان لبیک کہنے والوں میں ایک بڑی تعداد ہمارے ان بھائیوں کی تھی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔

دوسری طرف ہمارے بعض ایسے مہربان بھی تھے جنھوں نے خفیہ ریشہ دوانیوں سے یا ناشائستہ الفاظ کے ذریعہ اردو کے حق کو ناحق ثابت کرنے کی کوششیں کیں۔ ایک اور حرکت ایسی کی گئی ہے جو ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے اور جسے منسوخ کرائے بغیر ہم چین سے نہیں بیٹھ سکتے اور وہ ہے مدت کا تعین یعنی لسانی اقلیتوں کو جو تھوڑے بہت حقوق ملے بھی ہیں وہ گویا صرف عارضی مدت کے لیے ہیں۔ پڑوسی ریاستوں سے ملے ہوئے دیہات و تعلقات میں بسنے والی چھوٹی چھوٹی لسانی اقلیتوں کے متعلق تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا ان کی آئندہ نسلیں آندھرا ہی میں رہیں گی یا اپنی اپنی ریاستوں میں چپکے سے کھسک جائیں گی لیکن جہاں تک اردو والوں کا تعلق ہے، ان کا مستقبل تو ہمیشہ کے لیے اس ریاست سے وابستہ ہے۔ انھیں یہیں رہنا بسنا ہے اور یہیں جینا مرنا ہے ان کے بنیادی حقوق کو عارضی رنگ چڑھانے کی کوشش کرنا نہ انصاف ہے نہ دانائی۔

اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر حکومت کا یہ فیصلہ ہے کہ جب کوئی لسانی گروہ اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دلانا چاہے تو اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ سارے غیر متوالی اخراجات برداشت کرے اور کلاسوں کے لیے جگہ بھی مہیا کرے۔ اگرچہ کہنے کو یہ شرط اکثریتی زبان والوں پر بھی لاگو کی گئی ہے۔ لیکن عملی طور پر لسانی اقلیتیں اور ان میں بھی سب سے زیادہ اردو اقلیت ہی اس کا خاص طور پر شکار ہوتی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے راستے میں اس طرح رکاوٹ ڈالنا کیونکر گوارا کرسکتا ہے۔ ایک طرف آپ جبری تعلیم کے قوانین نافذ کرتے جائیں اور دوسری طرف اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے خواہشمند ماں باپ سے بڑی بڑی رقموں کا مطالبہ کریں۔ دستور ہند کے دفعہ ۴۵ میں تو یہ ہدایت درج ہے کہ چودہ سال کی عمر تک کے باشندوں کو حکومت مفت اور جبری تعلیم دینے کی کوشش کرے۔ لیکن جب خود ماں باپ اپنے بچوں کو لے کر اسکولوں پر پہنچیں تو ان سے کہا جائے کہ جب تک فلاں فلاں سامان مہیا نہ کرو اور اتنے کمروں کا انتظام نہ کرو ہم تمہارے بچوں کو معمولی لکھنا پڑھنا بھی نہیں سکھا سکتے۔ یہ کچھ عجیب بے جوڑ سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہندوستان کا دستور اس لیے بنا ہے کہ اس پر ایمانداری سے عمل بھی کیا جائے نہ اس لیے کہ وہ محض کاغذ کی زینت بنا رہے۔

اردو کی متوازی جماعتیں کھولنے میں جو غیر معمولی تعویق ہوتی ہے سال گذشتہ ہم نے اپنی قرارداد میں اس طرف بھی توجہ دلائی تھی۔ اس شکایت کو دور کرنے کے لیے اب جماعتیں کھولنے کا اختیار ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسروں کو دیا گیا ہے۔ نہیں معلوم یہ اصلاح کس حد تک موثر ثابت ہوئی کیونکہ اصل رکاوٹیں ضلع پریشدوں اور پنچایت سمیتیوں کی سطح پر پیش آتی ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ حکومت ان شکایات کی جانچ کے لیے جو صرف تعلیم کے شعبہ تک محدود نہیں ہیں، جلد کوئی مناسب اقدام کرے۔

موصوف نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہماری طرف سے شکایتیں اور حکومت کی طرف سے ان کی توضیح اور تلافی، یہ سلسلہ تو ایک مدت سے جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا اور حقیقت میں یہی جمہوریت

کی جان بھی ہے۔ اس سے مایوس ہو کر بے عملی کی راہ اختیار کرنا نہ صرف نادانی بلکہ بد دیانتی ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے اپنے طور پر خود اپنا محاسبہ کریں اور اگر ایسی کوئی غلطی سرزد ہو رہی ہے تو جلد اس کا تدارک کریں۔

جناب سریناواس لاہوٹی معتمد تنظیمی نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اس وقت ریاست کے چودہ اضلاع میں انجمن کی ۵۰ شاخیں قائم اور سرگرم عمل ہیں انھوں نے قانون سرکاری زبان میں اردو کے موقف سے متعلق انجمن ترقی اردو کی طرف سے مختلف علاقوں میں منعقدہ کردہ جلسوں کا ذکر بھی کیا۔

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کے سالانہ اجتماع میں قرار دادوں کی منظوری

حیدرآباد۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی جانب سے منعقدہ ریاستی اردو کارکنوں کے دوسرے سالانہ اجتماع نے ایک قرارداد کے ذریعہ آج حکومت آندھرا پردیش سے قانون سرکاری زبان میں اردو کے سرکاری استعمال سے متعلق دفعہ ۸ میں درج "مدت" کے الفاظ کو فوری حذف کر دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی نائب صدر انجمن نے صدارت کی۔ ابتدا میں جناب حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور مولوی حبیب الرحمن معتمد انجمن ترقی اردو نے قراردادوں کی وضاحت کی اور مندرجہ ذیل قراردادیں متفقہ طور پر منظور ہوئیں۔

قرارداد نمبر ۱۔

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں اور اردو دوستوں کا یہ اجتماع آندھرا پردیش آفیشیل لنگویج ایکٹ بابت ۱۹۶۶ء کا خیر مقدم کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ ریاستی حکومت جلد اس قانون کو نافذ کرنے کی طرف متوجہ ہوگی تلگو کے ساتھ اردو کو بھی سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنے کے لیے دفعہ ۸ میں جو گنجائش رکھی گئی ہے امید ہے کہ اس سے اردو بولنے والوں کے دیرینہ مطالبے کی تکمیل ہوگی۔ لیکن دفعہ مذکور میں مدت کا تعین کر کے اردو کے استعمال کو ایک عارضی چیز ظاہر کرنے کی جو نامناسب کوشش کی گئی ہے اسے یہ اجتماع سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ قانون کی دفعہ ۸ میں ضروری ترمیم کر کے مدت کے تعین کی شرط کو برخاست کرے نیز کھلے طور پر صراحت کر دے کہ جہاں جہاں اردو بولنے والوں کی دس فیصدی آبادی ہوگی وہاں سرکاری اغراض کے لیے تلگو کے ساتھ اردو بھی استعمال کی جائے گی۔

قرارداد نمبر ۲

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں اور اردو دوستوں کا یہ اجتماع حکومت کی اس پالیسی پر سخت تشویش اور ناراضگی کا اظہار کرتا ہے جس کے تحت موجودہ تلگو اسکولوں میں اردو کی متوازی جماعتیں کھولنے کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اردو بولنے والے اس غرض کے لیے کافی جگہ مہیا کریں اور غیر متوالی اخراجات کی پابجائی کے لیے ضروری رقم مہیا کریں۔ دیہات و تعلقات میں رہنے والی اردو اقلیت کے افراد ویسے ہی انتہائی معاشی پستی میں مبتلا ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ ان کے بچوں کو کم از کم چودہ سال کی عمر تک مفت تعلیم مہیا کرے چنانچہ دستور ہند میں بھی ایسی ہی ہدایت دی گئی ہے۔ یہ اجتماع حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ملک کی موجودہ تعلیمی پستی کو جلد از جلد دور کرنے کی خاطر فوراً مذکورہ بالا شرائط کی منسوخی کا اعلان کرے۔

قرارداد نمبر ۳۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کو دیہات و قصبات میں کئی سال سے یہ تجربہ ہو رہا ہے کہ اردو کی تعلیم میں سب سے زیادہ دشواریاں ان صورتوں میں پیش آتی ہیں جہاں تعلیمی امور سے متعلق اختیارات پنچایت سمیتوں اور ضلع پرشیدوں کے سپرد کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر اداروں کو پورے طور پر ان مسائل کی طرف توجہ کرنے کی کم فرصت ملتی ہے اس لیے انجمن ترقی اردو کے کارکنوں کا یہ اجتماع حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ تعلیمی اختیارات پورے طور پر اپنے ہاتھ میں لے لے۔

قرارداد نمبر ۴۔ اردو تعلیم کے متعلق آندھرا پردیش کے مختلف مقامات سے طرح طرح کی شکایات انجمن کے صدر دفتر پر وصول ہوتی رہتی ہیں ان کی تعداد میں گذشتہ چند سال کے اندر غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ ریاستی انجمن یہ ساری شکایات نظامت تعلیمات تک پہنچاتی اور ان کی تلافی کے لیے محکمہ کو متوجہ کرتی رہتی ہے لیکن دفتر نظامت کو غالباً اپنی گوناگوں اہم مصروفیات کے باعث بر وقت ان شکایات پر توجہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اردو تعلیم کے مسائل اب خود اتنی اہمیت اختیار کر گئے ہیں کہ مناسب انصرام کے لیے ایک ہمہ وقتی دورہ کرنے والے افسر کی ضرورت ہے۔ انجمن ترقی اردو کے کارکنوں کا یہ اجتماع حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ اس غرض کے لیے ناظم تعلیمات کے ماتحت ایک اسپیشل افسر کا تقرر کرے جو مختلف مقامات کا دورہ کر کے اردو تعلیم کی حقیقی مشکلات سے محکمہ کو باخبر رکھے اور ان شکایات کے جلد رفع کرنے کا انتظام کر سکے۔

قرارداد نمبر ۵۔ آندھرا پردیش کے اکثر علاقوں سے اردو ذریعہ تعلیم کے اساتذہ کی عدم فراہمی کی بکثرت شکایتیں آ رہی ہیں۔ اس بارے میں بارہا نظامت تعلیم کو متوجہ کیا جا چکا ہے اور ابھی حال ہی میں جناب ناظم صاحب تعلیمات کو بھی ایک ہم سرکاری مراسلے کے ذریعہ ان مدارس کی فہرست روانہ کی گئی ہے جہاں اردو اساتذہ کی فوری ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اردو اساتذہ کی ٹریننگ کے بھی کوئی تشفی بخش انتظامات ابھی تک نہیں کیے گئے ہیں۔ اس لیے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کا یہ اجتماع حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ جلد مختلف مضامین پڑھانے والے اردو اساتذہ کی فراہمی کا معقول انتظام کرے اور ساتھ ہی اردو اساتذہ کے ٹریننگ کے لیے بھی ایسے مستقل انتظامات کرے کہ آئندہ تربیت یافتہ اردو اساتذہ کے بارے میں دشواریاں پیش نہ آئیں۔

قرارداد نمبر ۶۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کے اس اجتماع کی رائے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی سکنڈ لنگویج کی فہرست میں کلاسیکل و جدید ہند زبانوں کا شمول کسی طرح مناسب نہیں ان زبانوں کا صحیح مقام انتخابی مضامین کی فہرست ہے۔ انھیں سکنڈ لنگویج کے طور پر پڑھانے سے ہندوستان کی دیگر زبانوں میں طلبہ کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور اکثر طالب علم ایک ہم لسانی [illegible]

اظہار سے محروم ہو جاتے ہیں یہ قومی اور تعلیمی دونوں لحاظ سے ان کے لیے بے حد مضر ہے۔

قرارداد نمبر۷۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کا یہ خصوصی اجتماع عثمانیہ یونیورسٹی اور وینکٹیشور یونیورسٹی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ پری یونیورسٹی [illegible] کا فوری انتظام کرے، تاکہ اردو کے ذریعہ میٹرک کا امتحان کامیاب کرنے کے خواہشمند وہ سیکڑوں طلبہ اور طالبات جو غیر معمولی زحمت اور اخراجات برداشت کر کے دوسری یونیورسٹیوں کے امتحانات میں شریک ہو رہے ہیں اپنی یونیورسٹی کے امتحانات میں شریک ہو سکیں اور وہ طلبہ اور طالبات جو دوسری یونیورسٹیوں کے امتحانات میں شریک ہونے کی استطاعت نہیں رکھتے اور نتیجتاً تعلیم سے محروم ہو جاتے ہیں مقامی امتحان میں شریک ہو کر اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔

قرارداد نمبر۸۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کا یہ خصوصی اجتماع سری وینکٹیشور یونیورسٹی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اورینٹل ٹائٹلز کے امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ اور طالبات کے لیے انٹرنس کے امتحان کے انعقاد کا فوری انتظام کرے تاکہ اس نصاب تعلیم سے استفادہ کرنے والوں کی راہ میں بحالت موجودہ جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہوں۔

ایک علیحدہ قرارداد میں جامعہ عثمانیہ اور دوسری جامعات میں جدید ہندوستانی زبانوں کی حیثیت سے اردو کو بحیثیت ثانوی زبان تعلیم کے انتظام کی ضرورت بھی محسوس کی ہے۔ جناب سریواس [illegible] معتمد تعلیمی کے شکریہ پر یہ دو روزہ اجتماع آج شام اردو ہال میں اختتام کو پہنچا۔

بہار میں ریاستی سطح پر اردو کو تسلیم کرنے کا فیصلہ

پٹنہ۔ ریاستی حکومت نے اردو کو ابتدائی درجات میں جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے جب اردو پڑھنے والے کم سے کم ۴۰ طلبہ ہوں تعلیم کے ذریعہ کے طور پر تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہی اصول ثانوی درجات کے طلبہ کو ان اداروں میں بہم پہنچایا جائے گا جہاں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد ۱۰ یا کم سے کم ۸ ہے۔ ریاست کے کسی افسر یا سرکار کے نام اردو میں لکھی ہوئی چٹھیوں فریادوں اور درخواستوں نیز عدالتوں میں پیش کی جانے والی اردو کی عرضیوں اور زمینوں کی دستاویزوں کو بھی سرکاری فیصلوں کے نفاذ کے بعد تسلیم کیا جائے گا۔

صفحہ ۲ سے آگے

ایک ناقد کو یہ اندازہ ہونا چاہیے کہ نظر زبان کے اس اسراف اور غلط استعمال کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ دو لفظوں "دیکھو" اور "بھی" کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے کہ بیشتر موقعوں پر ان کی موجودگی محض برائے وزن معلوم ہوتی ہے۔

وہ نظم جس کا پہلا مصرع ہے۔ "مجھ سے کہتا ہے میرا کاسۂ سر" میر کے مشہور قطعہ "کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو پڑ گیا" کی تشریح و تفسیر ہے۔ خیال وہی ہے الفاظ اور انداز بیان بدلا ہوا ہے۔

طویل نظموں کو شاعر سنبھال نہیں پایا ہے۔ لیکن خیال کے لحاظ سے بعض نظمیں قابل قدر ہیں اس لیے کہ ان میں جرات فکر ملتی ہے مثلاً "گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا" سے شروع ہونے والی نظم جس میں کہیں کہیں موجودہ دور اور اس کے مسائل کا عکس بھی ملتا ہے۔ جنگ، استعماریت، انتشار، بے یقینی اور خوف ایسے عالمگیر موضوعات کی طرف بھی کہیں مبہم اور کہیں واضح اشارے کیے گئے ہیں۔ ان مسائل کے آ جانے سے یہ مجموعہ اپنے عہد کی چیز کہلائے جانے کا حقدار ہے۔ مختصر نظموں میں "اے ابر رحمت" "یہ زمیں اپنی کیسی پیاری تھی" "تاریک آسماں ہے، تاریک ہے زمیں بھی" "دنیا سے دور ظلمت اب ختم ہو رہا ہے" اچھی نظمیں قرار دی جا سکتی ہیں جن کی موجودگی اس مجموعے کی اشاعت کا جواز بن سکتی ہے۔

تخلیق ادب شیش محل کی تعمیر کا کام ہے۔ جس کے لیے دقت نظر، خوش ذوقی، باریک بینی، ریاضت اور تمام عناصر شعر کا متناسب امتزاج ضروری ہے۔ تنقید اگر تخلیق کی دشواریوں سے واقف نہ ہو تو وہ ایسا بے رحم تیشہ بن جاتی ہے جس کی ایک ضرب سے حسین اور قابل قدر سے قابل قدر محل گرایا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ناقد تخلیق کے "رموز کن فیکون" کا بھی مزاج شناس ہو۔ تنقید کے لیے تخلیقی عمل سے واقفیت فن و فنکار کا احترام اور ان کی طرف ہمدردانہ رویہ ایک لازمی شرط ہے اس کے بغیر توازن اور اعتدال پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس توازن کے فقدان کی وجہ سے بڑے بڑے علمائے ادب اور نظریہ ساز عملی تنقید کے میدان میں "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد" کے مصداق بن جاتے ہیں۔ کلیم الدین صاحب کی تنقید میں اس توازن اور اعتدال کی ہمیشہ کمی رہی ہے اب جب کہ وہ شاعر کی حیثیت سے تخلیق کے ہفت خوان طے کر رہے ہیں ان سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کی نہیں خود اپنی تخلیقات کی روشنی میں تنقید کے تیشے کو تخریب کے بجائے تعمیر کے لیے کام میں لائیں گے۔ کلیم صاحب نے ایک جگہ کہا ہے

کوئی سمجھاؤ میرے شعروں کو
یہ میری بات کچھ نہیں سنتے
نت نئی شوخیاں دکھاتے ہیں

شعروں کو قابو میں لانے کے لیے کسی ریاضت کے ساتھ مزاج میں توازن ضروری ہے۔ ادب لفظوں کا آرٹ ہے بے جان لفظوں کا نہیں ان لفظوں کا جو مسیحا کے ہاتھ میں جاندار بن کر بولنے لگتے ہیں۔ تنقید ہو یا شعر اگر لفظ محض بندھی ٹکی اصطلاحیں یا ترسیل خیال کا بے جان آلہ بن جائیں تو پھر وہ نت نئی شوخیاں تو کیا دکھا سکتے ہیں، مگر تنقید و تخلیق کے سرکشوں کو فاش نہیں کر سکتے۔

اردو دنیا کو کلیم صاحب کی ان نظموں کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ امید کرنا چاہیے کہ ان کی آئندہ نظمیں فنی لحاظ سے زیادہ مکمل، مضبوط اور خیال و طرز بیان کے لحاظ سے زیادہ جاندار ہوں گی۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر پبلشر ادریس قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوایا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا